ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.1 (2026)
(January to March)

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں ادبی شخصیات کی باز آفرینی

The Re-creation of Literary personalities in travelogues of Mustansar Hussain Taarar

ملائیکہ احمد
ایم۔فل اسکالر، شعبہ اُردو زبان وادب، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا
ڈاکٹر سمیرا اعجاز
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو زبان وادب، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

Malaika Ahmed
M.Phil Scholar, Department of Urdu Language & Linguistic, University of Sargodha, Sargodha
Dr. Sumaira Ijaz
Associate Professor, Department of Urdu Language & Linguistic, University of Sargodha, Sargodha

Article Details
Received:
February 28, 2026
Accepted:
March 05, 2026
Online Published:
March 30, 2026

Copyright: © 2026 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: This article explores the portrayal of Lahore's literary personalities in the travelogues of Mustansar Hussain Tarar, one of Pakistan's most prolific and influential Urdu writers. Renowned for redefining the genre of safar-nama (travel writing) with his vivid narrative style, personal reflections, and cultural depth, Tarar frequently weaves Lahore the cultural and literary heart of Pakistan into his journeys, both literal and introspective. Through works such as Lahore Awargi, alongside references in other travelogues and writings, Tarar presents a dynamic mosaic of Lahore's literary figures, capturing their idiosyncrasies, intellectual contributions, and lived experiences within the city's bustling streets, cafes, and literary circles. His depictions blend nostalgia, humor, and acute observation, transforming personal encounters and collective memory into a vibrant chronicle of Lahore's enduring literary heritage.

Key words: Mustansar Hussain Tarar, intellectual contributions, literary circles, literary heritage, contemporary readers

مستنصر حسین تارڑ کی لاہور سے گہری ذاتی وابستگی ان کی پیدائش بچپن، تعلیم، ادبی زندگی اور ذاتی یادوں سے جڑی ہوئی ہے، اِن کا بچپن بیڈن روڈ پر واقع لکشمی مینشن میں گزرا قیام پاکستان کے وقت وہ لاہور میں ہی تھے اور تقسیم کے جذبات ومشاہدات نے ان کی تحریروں کو متاثر کیا۔ تارڑ کی ادبی ٹیلی ویژن اور صحافتی زندگی بھی لاہور سے وابستہ رہی ان کے متعدد ناول، سفر نامے اور کالم لاہور کے ماحول، لوگوں اور تبدیلیوں سے متاثر ہیں مستنصر حسین تارڑ سفر نامے لاہور آوارگی اور لاہور دیوانگی، پیار کا پہلا پنجاب میں اُن کی ذاتی محبت اور طویل رفاقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ لاہور ان کے لیے صرف شہر نہیں بلکہ جذباتی گھر، یادوں کا خزانہ اور تخلیقی مرکز

ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں میں لاہور کا بار بار ذکر کیا ہے اُنھوں نے لاہور کو اپنے سفر ناموں میں تاریخی ثقافتی، سیاسی اور سماجی زاویوں سے بیان کیا ہے لاہور آوارگی میں لاہور کے متعدد ادوار کا احاطہ کرتا ہے تارڑ کہتے ہیں کہ کسی بھی قدیم شہر کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ اندرون لاہور کی گلیوں کوچوں، حویلیوں اور تاریخی مقامات کی آوارگی کرتے ہیں۔ لاہور کی خوشبو، گلیوں کی رونق کھانے پینے روایات اور شہر کی "روح" کو دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ لوگوں کی روز مرہ زندگی کو زندہ کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر اپنی بچپن کی یادوں اور والد صاحب سے منسلک تندور جیسے لمحات کے ذریعے خاندانی اور سماجی رشتوں کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر سفر نامے لاہور کے زوال، تسلسل اور محبت بھری روح کو بیان کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے "پیار کا پہلا پنجاب"، "لاہور آوارگی"، "لاہور دیوانگی" میں وہ لاہور کی تاریخ، ثقافت، سماجی پہلو، علمی وادبی فضاء کے ساتھ لاہور کی ادبی شخصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں لاہور کی شخصیات اور علمی ادبی فضاء کی پیشکش بہت ذاتی، زندہ دل تاریخی اور مشاہداتی انداز میں ہوتی ہے وہ اپنے سفر ناموں میں لاہور کی تہذیبی روح، قدیم گلیوں اور علمی وادبی فضا کی ایسی دلکش تصویر کشی کی ہے جو قاری کو عہد رفتہ کی یاد دلاتی ہے ان کی تحریروں میں لاہور صرف اینٹ اور پتھر کا شہر نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی تہذیب ہے ان کے سفر ناموں میں لاہور کے قدیم باشندوں، ادیبوں اور فنکاروں کا ذکر بھی ملتا ہے جو ان کی آوارگیوں اور ادبی محفلوں کا حصہ ہوتا ہے۔ لاہور کی ادبی اور تہذیبی فضاء تارڑ کے تخیل میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں میں سعادت حسن منٹو، قرۃالعین حیدر، شاہ حسین، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، ن۔م۔ راشد اے حمید، شبنم شکیل، کشور ناہید، فیض احمد فیض، مشفق خواجہ جیسے بڑے لوگوں کا ذکر کرتے ہیں اِن کے سفر ناموں میں لاہور کی شخصیات کا ذکر اکثر سرسری، عارضی اور ضمنی ہوتا ہے لاہور کے ادبی حلقوں یا شخصیات کا ذکر جب آتا ہے تو وہ پسِ منظر کی طرح ہوتا ہے ایک یاد، حوالہ یا مختصر موازنہ کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ مختصر اُن کا ادبی تعارف اور ادبی کام کا ذکر کرتے ہیں ان کے سفر ناموں کا مزاج آوارگی کا ہے چلتے رہنا، دیکھتے رہنا، محسوس کرتے رہنا تفصیلی ادبی خاکے یا داشتیں ان کے سفر ناموں کا موضوع نہیں ہوتیں۔ ان کے سفر ناموں میں لاہور کی ادبی شخصیات کا ذکر اس لیے سرسری رہتا ہے کہ وہ خود اِن شخصیات کے "بیان کنندہ" کے بجائے ایک مسافر کے طور پر پیش کرتے ہیں جو لاہور کو اپنے ساتھ لیکر چلتا ہے مگر اسے سفر کے مرکز میں نہیں رکھتا۔ وہ شخصیات کا لاہور سے اُن کے گہرے تعلق کی صورت میں پیش کرتے ہیں اُن کا ذکر شاعرانہ اور ذاتی مشاہداتی کرتے ہیں مستنصر حسین تارڑ کا انداز بیانیہ اور مکالماتی ہے۔

- **"شاہ حسین لاہوری":**

شاہ حسین لاہوری ۱۵۳۹ء میں ٹکسالی دروازے لاہور میں پیدا ہوئے آپ کے والد گرامی کا نام شیخ عثمان تھا جو کپڑا بننے کا کام کرتے تھے آپ کے دادا نام کلجس رائے ہندو تھا جو فیروز شاہ تغلق کے دور میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن والد حلقہ بگوش اسلام ہوئے آپ کا خاندانی نام ڈھاڈھا حسین تھاڈھاڈھا پنجاب کے راجپوتوں کی ایک ذات ہے والد شیخ عثمان بافندگی یعنی کپڑے بننے کے پیشے سے منسلک تھے آپ محلے میں حسین جولاہا کے نام سے جانے جاتے تھے۔ شاہ حسین تصوف کے فرقہ ملامتیہ سے تعلق رکھنے والے صاحب کرامت صوفی بزرگ اور مشاعر تھے۔ وہ اس عہد کے نمائندہ ہیں جب شہنشاہ اکبر مسند اقتدار پر متمکن تھا۔ شاہ حسین پنجابی زبان وادب میں کافی کی صنف کے موجد ہیں وہ پنجابی کے اولین شاعر تھے اُنھوں نے ہجر وفراق کی کیفیات اور عورت کی پُر تاثیر زبان استعمال کی شاہ حسین نے بے مثل پنجابی شاعری کی اُن کی شاعری میں عشق حقیقی کا اظہار ہوتا ہے اپنے پیشے بافندگی کے روز مرہ کے

استعمال کی اشیاء اور آلات مثلاً چرخہ، سوت، تانا، بانا وغیرہ کو صوفیانہ اور روحانی معنی پہنائے اپنی زندگی کے ایک حصے میں شاہ حسین کی مادھولال حسین سے ملاقات ہوئی مادھولال ایک برہمن زادتھے مادھو سے شاہ حسین کو پیار تھا اوخود مادھو بھی اِن کو چاہتے تھے وہ یہاں تک لکھتے ہیں کہ "شاہ حسین مادھو سے کسی صورت جدا ہونے کے لیے آمادہ نہ تھے"۔ لاہور میں برس ہابرس تک درویشانہ رقص و سرور کی محفلیں آباد کرنے کے بعد ۱۵۹۹ء میں شاہ حسین کا انتقال ہوا اُن کی قبر اور مزار لاہور کے شالیمار باغ کے قریب باغبورہ میں واقع ہے ہر سال میلہ چراغاں کے موقع پر ان کا عُرس منایا جاتا ہے۔ ان کی تصنیف "کلامِ شاہ حسین" ترتیب کردہ "سید نذیر احمد" ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامہ "پیار کا پہلا پنجاب" میں شاہ حسین کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "داراشکوہ کی تصنیف "شطیحیات" میں درج ہے کہ جب اُنھوں نے نماز کے دوران وہ آیت پڑھی کہ دنیا کی زندگی تو محض کھیل تماشا ہے تو انھوں نے نماز توڑ دی داڑھی منُڈوا دی سُرخ لبادہ پہن لیا پاؤں میں گھنگرو باندھ لیے شراب پینے لگے اور رقص کرنے لگے"۔
>
> (۱)

سفر نامے میں ایک اور جگہ مستنصر حسین تارڑ شاہ حسین کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "شاہ حسین کے بارے میں سب سے مستند کتاب سید بابر علی کی شائع کردہ، گورنمنٹ کالج کے درویش پرنسپل سید نذیر احمد کی تخلیق و ترتیب کردہ "کلامِ شاہ حسین" ہے۔"
>
> (۲)

- **"امرتا پریتم":**

امرتا پریتم پنجابی ادب کی سب سے ممتاز، بااثر اور پہلی اہم خاتون شاعرہ، ناول نگار اور مضمون نگار تھیں وہ ہندی اور پنجابی میں لکھتی تھیں اور ان کا کام محبت، تقسیم ہند کے المیے، عورت کی آزادی، وجودیت اور انسانی جذبات کی گہرائی کو بیان کرتا ہے امرتا پریتم کا پیدائشی نام امرت کور تھا اُن کی پیدائش ۱۹۱۹ء کو گوجرانوالہ میں ایک سکھ کا خاندان میں ہوئی والد کرتار سنگھ ہتکاری ایک شاعر عالم، بیراج بھاشا کے ماہر اور سکھ پرچارک تھے جبکہ والدہ راج بی بی سکول ٹیچر تھیں وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں گیارہ سال کی عمر میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا جس نے ان کے دل پر گہرا اثر چھوڑا اس تنہائی اور غم نے انہیں شاعری کی طرف راغب کیا والد کے ساتھ لاہور منتقل ہوئی جہاں اُنھوں نے ادبی ماحول میں پرورش پائی۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ "امرت لہران" ۱۹۳۶ء میں محض سولہ سال کی عمر میں شائع ہوا۔ اسی سال ان کی شادی پریتم سنگھ سے ہوئی اور وہ امرت کور سے امرتا پریتم بن گئی تقسیم ہند امرت کی زندگی اور ادب کا سب سے بڑا موڑ ثابت ہوا وہ لاہور سے ہجرت کر کے دہلی منتقل ہوئیں لیکن اس ہجرت کے کرب نے اُنہیں وہ الفاظ دیے جو آج بھی سرحد کے دونوں پار گونجتے ہیں۔ ان کی نظم "آج اکھاں وارث شاہ نوں" تقسیم ہند کے فسادات اور عورتوں پر ہونے والے مظالم پر لکھی گئی یہ نظم ان کی پہچان بن گئی امرتا پریتم کی زندگی محبت اور جدوجہد کا حسین امتزاج رہی ساحر لدھیانوی کے لیے ادھوری محبت کے قصے ان کی خودنوشت میں شامل ہے اپنی زندگی کے آخری ۴۰ سال اُنھوں نے مصور اور ادیب امروز کے ساتھ گزارے جو ان کی وفات تک ان کے ساتھ رہے ان کی اس انوکھی رفاقت پر "امرتا امروز ایک لو اسٹوری" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی گئی۔

امر تا پریتم وہ پہلی خاتون تھیں جنھیں ۱۹۵۶ء میں پنجابی ادب پر "ساہتہ ایوارڈ (۱۹۸۲ء) ملا گیان پیٹھ ایوارڈ بھی ملا اس کے علاوہ پدم وبھوس (۲۰۰۴) سے بھی نوازا گیا وہ راجیہ سبھا کی کے رکن بھی رہیں۔ ۲۰۰۵ء کو نئی دہلی میں طویل علالت کے بعد ان کا انتقال ہو۔ ان کی تصانیف "دو آوازیں"، تیرھواں سورج"، "ایک تھی انیتا"، پنجر "ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> "اور مجھے یاد ہے جب میں آج سے تقریباً چالیس برس بیشتر اپنے دوست مطیع الرحمن کے ہاتھوں اپنا پنجابی ناول "پکھیرو" اور اندلس میں اجنبی" امر تا پریتم کو بھیجے تو امر تا نے "پکھیرو" کو پنجابی زبان کا جدید ناول قرار دیا اندلس پر بہت ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ تارڑ متعصب مسلمان ہے"۔(۳)

مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے "پیار کا پہلا پنجاب" میں امر تا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "دلی سارک کانفرس کے سلسلے میں گیا تو بہت آرزو تھی کہ امر تا سے ملاقات ہو جائے امر تا کو ملنے سے مجھے فراز نے منع کر دیا وہ ان دنوں کسی کو نہیں پہچانتی، اتنی لاچار ہے کہ امروز اسے اٹھا کر واش روم تک لے جاتا ہے بہتر ہے کہ تم اپنی پرانی امر تا کے تصور میں رہو جس نے "رسیدی ٹکٹ" پنجر" اور "اج آکھاں وارث شاہ نوں"، جیسی تحریریں تخلیق کی تھی"۔(۴)

- **"منیر نیازی"**

منیر نیازی ۱۹ اپریل ۱۹۲۸ء کو ہشیار پور کے قصبہ خان پور کے ایک پشتون گھرانے میں پیدا ہوئے ان کے والد محمد فتح خان محکمہ انہار میں ملازم تھے منیر ایک سال کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی پرورش ماں اور چچاؤں نے کی منیر نیازی نے ابتدائی تعلیم منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں حاصل کی اور یہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے نیوی میں بطور ملازم ہو گئے ملازمت کے دنوں میں اُن کا ادبی شوق پروان چڑھا تو بمبئی کے ساحلوں پر اکیلے بیٹھ کر ادبی دنیا میں شائع ہونے والے سعادت حسن منٹو کے افسانے اور میرا جی کی نظمیں پڑھتے تھے ملازمت سے استعفی دے کر لاہور کے دیال سنگھ سے بی۔ اے کیا اور اسی زمانہ میں کچھ انگریزی نظمیں بھی لکھی۔ تقسیم کے بعد وہ ساہیوال میں ہی رہے اور اشاعتی ادارہ کھولا اس میں نقصان ہونے کے بعد وہ لاہور چلے گئے۔ جہاں مجید امجد کے اشتراک سے پرچہ "سات رنگ" نکالا ۱۹۶۰ء کی کی دہائی میں فلموں کے لیے گانے لکھے اور اُن کے گانے بڑی شخصیات مہدی حسن، نور جہان، نسیم بانو جیسے لوگوں نے گائے منیر نیازی کی شاعری اک طویل جلا وطنی کی پہلی جھلک دیکھنے سے مماثلت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں حیران کر دینے والے، بھولے ہوئے گمشدہ تجربات کو زندہ کرنے کی ایسی غیر معمولی صلاحیت ہے جو دوسرے شاعروں میں نظر نہیں آتی منیر نیازی ان شاعروں میں سے ہیں جو دو مختلف زبانوں اُردو اور پنجابی پر عبور رکھتے تھے اور اُردو ادب کا بڑا شاعر ہونے کا دعوہ کرتے ہیں۔ منیر نیازی اپنی جاذب شکل وصورت کے طفیل خواتین میں بہت پسند کئے جاتے تھے اُنھوں نے خود اعتراف کیا کہ اُن کو کم وبیش چالیس چالیس بار عارضہِ عشق لاحق ہوا بہر حال ۱۹۵۸ء میں انھوں نے بیگم ناہید سے شادی کر لی تھی منیر نیازی کے یہاں بے انانیت تھی وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

منیر نیازی کثرت سے شراب نوشی کے عادی تھے اور شراب کو اپنے سواسب کے لئے بُرا کہتے تھے آخری عمر میں اُن کو سانس کی بیماری ہو گئی تھی اور اسی بیماری میں ۲۶ ستمبر ۲۰۰۶ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ حکومتِ پاکستان نے اُنہیں پہلے "امتیاز" اور پھر پرائڈ

آف پرفارمنس" سے نوازا۔ اُن کی تصانیف میں "شعری مجموعہ"، "دشمنوں کے درمیان شام"، "تیز ہوا اور تنہا پھول"، "پہلی بات ہی آخری تھی"، "اِک دعا جو میں بھول گیا تھا"۔ افسانہ "دریں سرائے کہن" پنجابی شعری کلیات "کل کلام"، کالم کا عنوان "کچھ باتیں اَن کہی رہنے دو" وغیرہ شامل ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے "پیار کا پہلا پنجاب" میں منیر نیازی سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "منیر نیازی، جب بہت بیمار اور ناتواں ہو چکے تھے، کسی دوست کا سہارا لے کر اُس ایک عید پر مجھے ملنے چلے آتے "تم تو آتے نہیں میں چلا آیا ہوں اور اپنے ساتھ کلیاتِ منیر" بھی لائے تھے تو میں نے کہا، خان جی اس پر کچھ لکھ بھی دیں بعد کے زمانوں میں کون یقین کرے گا کہ یہ کلیات آپ نے عنایت کی تھی تو اُنھوں نے کہا تمہاری آوارگی اور جنون کے نام میں کچھ لکھتا ہوں: مستنصر کے لیے
>
> ایسا سفر ہے جس میں کوئی ہمسفر نہیں
> منظر اس طرح کا کہ دیکھا نہیں ہوا (۵)

- **"شفیق الرحمن":**

ڈاکٹر شفیق الرحمن ۹ نومبر ۱۹۲۰ء کلانور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام عبدالرحمن تھا اُنھوں نے ایم بی بی ایس (پنجاب) ڈی پی ایچ ایڈنبرا برطانیہ، ڈی ٹی ایم ایچ (لندن) فلیو آف فریشنز اینڈ سرجنز پاکستان سے حاصل کیں۔ آزادی کے بعد پاکستان آرمی کی طرف سے ایڈنبرا اور لندن یونیورسٹیوں میں اعلی تعلیم کے حصول کے لیے بھیج دیا گیا۔ زمانہ طالب علمی کے دوران کنگ ایڈورڈ کالج لاہور کے ادبی مجلہ کے ایڈیٹر رہے دوسری جنگ عظیم میں مختلف محاذوں پر ملازمت کرنے اور کئی ملکوں کی سیر کا موقع ملا ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد آپ کو بری سے بحری فوج میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں آپ کو اکادمی ادبیات پاکستان کا چیئرمین مقرر کر دیا گیا جہاں سے ملازمت ختم ہونے پر روالپنڈی میں ریٹائرڈ زندگی گزاری ان کے تین بیٹے تھے شفیق الرحمن ایک رومانوی افسانہ نگار ہیں اُن کے پہلے افسانوی مجموعے "کرنیں" کا دیباچہ حجاب امتیاز علی نے لکھا ۱۹ مارچ ۲۰۰۰ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اِن کی تصنیفات میں "شگوفے"، "مدوجزر"، "پچھتاوے"، "دجلہ"، "کرنیں"، "حماقتیں"، "مزید حماقتیں" "جنگ اور غذا" وغیرہ شامل ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے "پیار کا پہلا پنجاب" میں لکھتے ہیں:

> "شفیق الرحمن کی ایک کتاب "حماقتیں" صرف احمقوں نے نہیں پڑھی ہو گی اور اُن کی ایک اور کتاب "مزید حماقتیں" نام کی ہیں جو مزید احمقوں نے نہیں پڑھی ہو گی"۔ (۶)

مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے "لاہور دیوانگی" میں شفیق الرحمن کے بارے میں لکھتے ہے:

> "شفیق الرحمن نے مجھے "الحمرا کی کہانیاں" کا ایک قدیم نسخہ تحفے کے طور پر بھیجا جس میں قصر الحمرا کے ایوانوں، محرابوں اور باغوں کے پین اینڈ اِنک کے بلیک اینڈ وائٹ سکیچ پر باب کے آغاز میں نظر نواز ہوتے تھے"۔ (۷)

- **"سعادت حسن منٹو":**

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں میں سب سے زیادہ ذکر سعادت حسن منٹو کا کیا ہے اُردو افسانے پر جو اثر موپساں نے ڈالا اردو افسانہ نگاری میں اُس کا واحد نمائندہ منٹو ہے سعادت حسن منٹو ہمارے اُن رجحان ساز افسانہ نگاروں میں ہے جنہوں نے عالمی سطح پر اردو فکشن کا اعتبار قائم کیا جب منٹو نے کہانی لکھنے کا آغاز کیا تو وہ ترقی پسندوں کے عروج کا زمانہ تھا ۱۹۳۶ء کے بعد مارکسی نظریہ کے تحت سیاسی انسان کا تصور نئی کہانیوں میں مروج ہو چکا تھا منٹو بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور اُنھوں نے بھی انسان کے سیاسی مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ نتیجہ میں تماشا، نیا قانون، نعرہ، شغل جیسی کہانیاں وجود میں آتی ہیں منٹو کی کہانیوں کا دوسرا اہم موضوع فسادات ہے اُنھوں نے طوائف، جنس کو بھی موضوع بنایا ہے وہ حقیقت پسند انسان تھا جس کے ہاں آزادی کا تصور استحصالی بنیادوں پر قائم اپنے زوال آمادہ معروض سے قطعاً دکھائی نہیں دیتا منٹو نہ صرف ایک اچھے افسانہ نگار ہیں بلکہ ملک کے معروف مشہور ڈراما نگار، صحافیوں اور خاکہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ منٹو اپنے خاکوں میں ایسے افراد و اشخاص کو موضوع بنایا ہے جن سے وہ حقیقی زندگی میں ملے ہیں ان شخصیات کو پیش کرتے ہیں وہ محض ایک، عکاس یا نکال نہیں ہیں منٹو نے کل بائیس ادبی صحافی اور فلمی شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں جن میں "گنجے فرشتے"، "میرا صاحب"، "تین گولے"، "پری چہرہ نسیم بانو" شامل ہیں منٹو نے ایک ناول "بغیر عنوان کے" لکھا اور بہت ساری کہانیاں بھی لکھی۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامے "لاہور دیوانگی" میں باب "منٹو صاحب گھر نہیں تھے" لکھا جس میں وہ لکشمی مینشن کی پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ لکشمی مینشن میں مستنصر حسین تارڑ اور منٹو ساتھ رہتے تھے۔

> "ہمارا کرکٹ بال منٹو صاحب کے دروازے کا شیشہ توڑ کر گھر کے اندر چلا گیا تھا بس یہی شیشہ توڑ کر جو میرے سامنے تھا اگر تو صفیہ آپا گھر میں موجود ہوئیں تو ڈانٹ بھی پڑے گی اور بال بھی ضبط ہو جائے گی خدا کرے منٹو صاحب ہوں، وہ ڈانٹیں گے تو سہی لیکن عینک کے پیچھے اُن کی آنکھیں مسکرائیں گی"۔(۸)

- **"فیض احمد فیض":**

فیض احمد فیض ان کا قلمی نام ہے ان کا اصل نام فیض احمد خان تھا فیض ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو قلعہ کالا قادر ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ان کے والد گرامی کا نام چوہدری سلطان محمد خان تھا فیض احمد فیض کی والدہ کا نام سلطان فاطمہ ہے تعلیم کا آغاز حفظ قرآن سے ہوا لیکن تکمیل نہ پایا جس کی حسرت فیض کو ساری زندگی رہی مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی کے مکتب سے عربی، فارسی اور صرف نحو، کہانیوں کی کتابیں پڑھیں بعد ازاں اسکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں چوتھی جماعت میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کا باقاعدہ آغاز کیا میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا مرے کالج سیالکوٹ سے انٹر میڈیٹ کو مکمل کرنے کے بعد فیض لاہور آئے جہاں اُنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے آنرز کیا فیض احمد فیض نے دو مضامین (انگریزی اور عربی) میں ایم اے کی ڈگری حاصل کیں۔

فیض احمد فیض کی بیوی کا نام ایلس ہے فیض احمد فیض جس وقت اُردو شاعری پر نمودار ہوئے وہ کم و بیش ایسا دور تھا جس کی روایت صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ اس زمانے میں فیض ایک پل بن کر سامنے آئے جو روایت کی سنگلاخ چٹانوں کو تجربوں کی پُرخاری سے ملانا ہے فیض نے تجربہ پسندی اور بعض صورتوں میں بغاوت کے حاوی اور مروجہ میلانات سے گزرنے کے باوجود خود ضبطی، توازن اور اعتدال کو رواں رکھ کر اپنی جداگانہ حیثیت قائم کی ۱۹۳۰ء کے بعد جن شعرا نے اُردو شاعری میں امتیازی مقام حاصل کیا ان میں فیض کا نام سر فہرست ہے اُنھوں نے اپنے عہد کے فکری، تہذیبی اور شعری مزاج سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے ساتھ اُردو شعری روایات کا گہرا مطالعہ کیا۔ اُنھوں نے دو نمایاں موضوعات یعنی رومانیت اور اپنے عہد کے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے طبقاتی نظام کی پیدا

کردہ خرابیوں کو اپنی شاعری کی اساس قرار دیا ان موضوعات کے علاوہ انھوں نے حُب وطنی اور تقسیم وطن کے المیے کو بھی اپنا موضوع بنایا فیض کے شعری شعور میں گہرائی ہے۔

اپنے ابتدائی زمانے میں انھوں نے اپنے، دور اور ماقبل کے دور کے شعرا حسرت،، اختر شیرانی، جوش اور فراق کی شاعری کا مطالعہ کیا چناچہ اپنی شاعری کا آغاز اُنھوں نے عشقیہ تجربات سے کیا ۱۹۳۵ء میں جب وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو انھوں نے بھرپور انداز میں گردوپیش کی زندگی کے کھردرے پن کا مطالعہ کیا وہ رومانوی دھندگیوں سے باہر آئے اور سماجی حقائق کا سامنا کیا اس طرح سے انھوں نے اپنے معاشرتی شعور کو تیز تر کیا فیض کی شخصیت اپنے ماحول اور عہد کی پیداوار ہے۔ فیض کا انتقال ۱۹۸۴ء میں ہوا ۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامہ میں فیض احمد فیض کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامہ میں فیض احمد فیض اور محمد دین تاثیر کے بارے میں لکھا دونوں ہم زلف تھے وہ امرتسر کالج میں پڑھاتے رہے مستنصر حسین تارڑ جب امرتسر گئے تو اُنھوں نے وہاں کالج کی سیر کی اور فیض صاحب کا ذکر کیا"۔(۹)

علی احمد فاطمی کا کہنا ہے:

> "فیض کی شاعری کے دو نمایاں رُخ نہیں نظام مزاحمت جو سامراج اور استحصالی نظام کے خلاف ہے عشق، جو جیتی جاگتی محبوبہ سے ہے رومانس دونوں شامل ہے اس طرح دونوں رُخ خانوں میں بٹے ہوئے نہیں ہے بلکہ اکثر اپنے نظموں میں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں ان کی مزاحمت بھی بہت فطری لگتی ہے پھر ان کا اپناڈکشن ہے جو ہر طرح کے جذبات میں یکساں رہتا ہے"۔(۱۰)

- **"مجید امجد":**

مجید امجد ۱۹۱۴ کو جھنگ مگھیانہ میں پیدا ہوئے اُن کے والد کا نام علی محمد تھا وہ ڈسٹرکٹ بورڈ میں نائب قاصد تھے مجید امجد کا نام عبدالمجید رکھا گیا مجید امجد کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ مجید امجد کے ننھیال میں ایک خاص مذہبی، علمی اور ادبی ماحول تھا۔ مجید امجد کے نانا مذہبی عالم اور ایک متہجم تھے مگر ساتھ ہی شاعر تھے اور یہی صورت مجید امجد کے ماموں منظور علی کے ساتھ تھی وہ فارسی عربی اور اردو کے شاعر تھے فوق تخلص کرتے تھے منظور علی اسلامیہ ہائی سکول جھنگ میں فارسی کے استاد تھے اسی سکول میں مجید امجد نے ۱۹۳۰ء میٹرک کا امتحان پاس کیا مجید امجد کو مولوی غلام قاسم کے مدرسے میں بھیجا گیا جہاں مجید امجد نے روایتی تعلیم حاصل کی عربی اور فارسی پڑھی اور پھر فلسفہ، علم جعفر اور علم طب کا درس بھی لیا۔ مجید امجد نے ساتویں جماعت سے شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں مجید امجد نے گورنمنٹ انٹر کالج جھنگ میں داخلہ لیا ۱۹۳۲ء میں یہاں انٹر کا امتحان پاس کیا ۱۹۳۲ء کے بعد مجید امجد نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخلہ لیا ۱۹۳۴ء میں بی اے کی ڈگری کی مجید امجد کا جھنگ سے لاہور آنا ان کی زندگی کا اہم واقعہ تھا۔ بیسویں صدی کے انتہائی منفرد اور اہم شاعر عبدالمجید امجد تھے وہ نہایت وسیع المطالعہ شخص تھے اُن کے موضوعات کی بو قلمونی کے ساتھ ہیت کا تنوع بھی نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں فکر اور جذبے کی گہرائی موجود ہے اُن کی پوری شاعری پر وقت کا احساس حاوی نظر آتا ہے ان کی نظموں میں لمحہ حال کو بڑی اہمیت حاصل ہے زندگی، جبر، ازل، ابد، تہذیب، فطرت اور معاشرتی و سماجی موضوعات کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ عامر سہیل لکھتے ہیں:

"مجید امجد کثیر الجہتی افکار کا حامل شاعر ہے"۔(۱۱)

اُنھوں نے اُردو غزل کو ایک نئی سوچ اور نئے لب و لہجے سے آشنا کیا کائنات کی وسعتوں میں پھیلے موضوعات کو مجید امجد نے پیش کیا مجید امجد نے اپنے نظریے کو کسی مخصوص تحریک سے وابستہ نہیں کیا مجید امجد کی شاعری میں ہیت کے جتنے تجربات نظر آتے ہیں وہ کسی اور شاعر کے ہاں کم ہی ہوں گے مجید امجد کے ہاں نئے تشبیہات، استعارات، اور علامات کا استعمال کیا ہے مجید امجد کے ہاں خلوص اور صداقت ہے مجید امجد کی شاعری میں صوتی ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ مجید امجد کو غزل سے زیادہ نظم سے شغف تھا وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے مجید امجد ۱۹۷۴ء کو ساہیوال میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف میں "کون دیکھے گا"، "بندا"، "شبِ رفتہ"، "لوحِ دل،" زندگی اے زندگی" وغیرہ شامل ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامہ "لاہور دیوانگی" میں مجید امجد کی ایک نظم کا حوالہ دیتے ہیں:

"ہڑپے کا ایک کتبہ"

بہتی راوی ترے نٹ پر کھیت اور پھول اور پھل
تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کے چھل بل
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی اک ہالی اک ہل!
سینہ سنگ میں بسنے والے خداؤں کا فرمان
مٹی کاٹے، مٹی چاٹے ہل کی آنی کامان
آگ میں جلتا پنجر ہالی کا ہے کو انسان
کون مٹائے اس کے ماتھے سے دکھوں کی ریکھ
ہل کو کھینچنے والے جنوروں ایسے اس کے لیکھ
تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں تین بیل ہیں دیکھ"!(۱۲)
(مجید امجد)

- **"قرۃ العین حیدر":**

قرۃ العین حیدر ادب لطیف کے علمبر دار سجاد حیدر یلدرم اور اپنے زمانے کی نامور فلم قلمکار زہرہ سجاد حیدر کی دُختر ہیں قرۃ العین حیدر ۱۹۲۷ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں قرۃ العین حیدر کا تعلق سید گھرانے سے تھا بے حد علمی اور زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں جو کافی روشن خیال اور ترقی پسند بھی تھا۔ ان کے خاندان میں خواتین بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ قرۃ العین حیدر کی ابتدائی تعلیم دہرادون میں ہوئی ثانوی تعلیم لاہور اور لکھنؤ میں اور انٹر میڈیٹ ۱۹۴۱ء میں ازابیلا تھوبرن کالج لکھنو یونیورسٹی سے پاس کیا ہے بی اے اندر پرستھ کالج دہلی یونیورسٹی سے کامیاب کیا اور ایم اے ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے پاس کیا۔ قرۃ العین حیدر کو مصوری کا شوق بھی تھا۔

والد کی وفات کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان لاہور میں آئیں قرۃ العین حیدر ایک فیض رساں شخصیت تھیں قرۃ العین حیدر جہاں نورد فنکارہ تھیں ساتھ ہی بے پناہ وہبی صلاحیتوں سے مالا مال تھیں۔ زود نویس ادیبہ تھیں اُن کا ادبی سرمایہ افسانے، ناول، ناولٹ ریپورتاژ، خاکے، تنقیدی مضامین اور اطفال ادب پر مشتمل ہے قرۃ العین حیدر آخری آیام میں بے حد کمزور ہو گئی تھیں ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء کو اُن کی وفات کی خبر ملی۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے وسیع تجربات و مشاہدات کو اپنی مختلف تصانیف کا

موضوع بنایا اُنہوں نے عصری مسائل و حالات کے ساتھ آفاقی عالمگیر صورتحال کے مرقعے اپنی تخلیقات میں پیش کیے۔ اُن کی تصانیف میں "ناولٹ"، "سیتاہرن"، "چائے کا باغ"، "کوہ دماوند"، "گل گشت"، "لندن لیٹر"، "آگ کا دریا"، "آخری شب کے ہمسفر" وغیرہ شامل ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامے "لاہور آوارگی" میں لکھتے ہیں:

> "جب قرۃ العین حیدر، پاکستان منتقل ہو کر یہاں آئی تھیں ہمیشہ کے لیے آباد ہو کر، اس سرزمین کو اپنا گھر بناڈالا ہر دل میں جاگزیں ہو کر، پھر "آگ کا دریا" لکھا، عینی آپا بار بار اپنے سرخ رنگے ہوئے بالوں کو سنوارتی، ہونٹوں پر لپ اسٹک اور وہ بھی شوخ رنگ کی لپ اسٹک درست کرتی لاہور کے اندرون کی گلی پر، کوچے میں جھانکتی اُنکے ناموں کی تختیاں پڑھتی ایک بار پلٹ کر انہوں نے کہا:
> "مستنصر۔۔۔۔۔۔ یہ تو ہو بہو پرانا لکھنؤ ہے"۔(۱۳)

- **"شبنم شکیل":**

شبنم شکیل نامور شاعر اور نقاد سید عابد علی عابد کی صاحبزادی تھیں وہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں ان کے شعری مجموعے شب زاد، اضطراب اور مسافت رائیگاں تھی اور نثری مجموعے "نہ قفس نہ آشیانہ اور "آواز تو دیکھو" کے نام سے اشاعت پزیر ہوئے تھے حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں صدارتی تمغہ برائے محسن کارکردگی عطا کیا تھا۔ شبنم شکیل بیسویں صدی کے نصف آخر سے اپنی شعر گوئی سے مرد شعراء کے مدِ مقابل شعر و ادب میں اپنی صلاحیتیں منوا رہی تھیں شعر و مشاعری کا شوق تو شبنم شکیل کو اپنے والد کی وجہ سے ہوا تھا۔ شبنم شکیل نے ابتدائی تعلیم کنیئرڈ کالج سے حاصل کی اس کے بعد اسلامیہ کالج لاہور سے گریجویشن کیا اور پھر اورینٹل کالج لاہور سے اُردو ادب میں ایم اے کیا شبنم شکیل نے اپنی ساری تعلیم لاہور سے حاصل کیں۔ اُنھوں نے متعدد کالجوں میں لیکچرار کے طور پر خدمات سر انجام دیں شبنم شکیل نے بہت کم عمری میں لکھنا شروع کیا ان کی پہلی کتاب "تنقیدی مضامین ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی ان کی شاعری میں گہرا انسانی شعور نمایاں ہے۔

اُنھوں نے خاکے، افسانے اور نسوانی شاعر پر انٹرویوز پر مشتمل کتابیں بھی مرتب کیں اُن کی شاعری کو مرکزی اہمیت حاصل تھی ان کو صدارتی پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ ۲۰۰۴ء میں ملا۔ ۱۹۶۷ء میں سید شمیم احمد سے شادی ہوئی جو سول سرونٹ ہیں شبنم شکیل کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے شبنم شکیل کی ابتدائی ذہنی تربیت سید عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، فیض احمد فیض، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ایم ڈی کے زیر سایہ ہوتی رہی۔ مارچ ۲۰۱۳ء کو مختصر علالت کے بعد کراچی میں وفات پا گئیں اور اسلام آباد میں آسودہ خاک ہیں۔ ان کے شعری مجموعے میں "شب زاد"، "اضطراب"، "مسافت رائیگاں تھی"، "تعریف کچھ تو"، اور نظموں میں "ایک دُعا"، "اپنے سوالوں کے جواب میں"، "سود و زیاں"، "قم باذن اللہ کی تاثیر اک آواز" وغیرہ شامل ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> "اُن کے گھر میں فیض صاحب کی ایک سالگرہ منائی تھی جس میں میڈم نور جہاں بھی شریک تھیں، کشور ناہید اور شبنم شکیل بھی اس محفل میں موجود تھیں"۔(۱۴)

ان کے علاوہ رائے محمد ناصر، خلیل مانک پوری، احمد بشیر، قتیل شفائی، تلوک چند محروم، ڈاکٹر انیس احمد، شاہد حسین زیدی، ابنِ انشاء، سید محمد لطیف کا ذکر بھی سرسری طور پر ملتا ہے مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں لاہور کی شخصیات اور علمی و ادبی فضا کی پیشکش بہت ذاتی، زندہ دل، تاریخی اور مشاہداتی انداز میں ہوتی ہے انھوں نے اپنے سفر ناموں میں لاہور کی تہذیبی روح، قدیم گلیوں

اور علمی و ادبی فضاء کی ایک دلکش تصویر کشی کی ہے جو قاری کو عہدِ رفتہ کی یاد دلاتی ہے ان کی تحریروں میں لاہور نہ صرف اینٹ اور پتھر کا شہر نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی تہذیب ہے ان کے سفر ناموں میں لاہور کے قدیم باشندوں، ادیبوں اور فنکاروں کا ذکر بھی ملتا ہے جو ان کی آوارگیوں اور ادبی محفلوں کا حصہ ہوتا ہے لاہور کی ادبی اور تہذیبی فضاء تارڑ کے تخیل میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے لکشمی مینشن کا ذکر کرتے ہیں جہاں وہ مختلف شخصیات کا ذکر کرتے ہیں لکشمی مینشن محض ایک رہائشی بلاک نہیں بلکہ بیسویں صدی کے نصف اول کا ادبی مرکز بن کر اُبھرتا ہے

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں "پیار کا پہلا پنجاب"، "لاہور دیوانگی"، "لاہور آوارگی" میں علمی و ادبی فضاء کو اُنھوں نے ایک تخلیقی زندہ اور فکری ماحول کے طور پر پیش کیا ہے مستنصر حسین تارڑ لاہور کو ادبی شہر کے طور پر دیکھتے ہیں جہاں گلیاں، حویلیاں اور چوک ادب اور فنون لطیفہ کی بازگشت رکھتے ہیں وہ پرانی لاہور کی ادبی محفلوں، شاعروں، مصوروں اور ادیبوں کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے شہر کی تخلیقی فضاء کو اُجاگر کرتے ہیں کتاب میں مصوری خالد اقبال، سعید اختر، غلام مصطفیٰ، اقبال حسین جیسے فنکار کی بات کی گئی ہے جو لاہور کی آرٹ گیلریوں اور رنگوں کی قوس قزح کے ذریعے شہر کی فنون لطیفہ والی علمی روایت کو زندہ کرتی ہے مستنصر حسین تارڑ جدید لاہور میں اس فضاء کے زوال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے پرانی ادبی حلقوں اور تخلیقی سرگرمیوں کی یاد تازہ کرتے ہیں وہ سفر ناموں میں کانفرس، شاعروں، تخلیق کاروں سے ہونے والی ملاقاتیں، ادبی نشستوں کا ذکر کرتے ہیں وہ تخلیق کاروں کی تخلیقات پر اپنا اظہارِ خیال بھی پیش کرتے ہیں لاہور ایک ادبی شہر کے طور پر اُبھرتا ہے جہاں تاریخ، شاعری اور فنون ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ باہم طور پر مربوط ہیں لاہور بھی کیا عجیب مہر نگاراں ہیں یہاں رنگ رنگ کے پھول مہکتے ہیں لاہور اور ادب کا ایک حسین امتزاج ہے جس کی تاریخ پرانی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور معلومات افزا ہے وہ سفر ناموں میں اپنے ادبی انٹرویوز، پی ٹی وی پروگرامز، کانفرنسز، دانشور، ادیبوں، صحافیوں کی ادبی بیٹھکوں کا ذکر کرتے ہیں وہ لاہور میں موجود لائبریریاں، اشاعت خانوں، کتاب فروشوں اور ادبی حلقوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں لاہور کے ادبی سیلون، تھیٹرز اور تکیہ تارڑ کے بارے میں تفصیل سے بیان ملتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مستنصر حسین تارڑ، پیار کا پہلا پنجاب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص:۸۸

۲۔ مستنصر حسین تارڑ، پیار کا پہلا پنجاب، ص:۸۸

۳۔ ایضاً، ص:۱۰۲

۴۔ ایضاً، ص:۱۳۲

۵۔ ایضاً، ص:۱۷۲

۶۔ ایضاً، ص:۲۵۲

۷۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور دیوانگی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء، ص:۱۷۲

۸۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور دیوانگی، ص:۱۸۲

۹۔ مستنصر حسین تارڑ، پیار کا پہلا پنجاب، ص:۳۱۴

۱۰۔ علی احمد فاطمی، فیض: ایک نیا مطالعہ، نوگڑھ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص: ۲۹

۱۱۔ عامر سہیل، سید مجید امجد: بیاضِ آرزو بکف، ملتان: شان بکس، ۱۹۹۵ء، ص: ۶۷

۱۲۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور دیوانگی، ص: ۴۳

۱۳۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، ص: ۲۹

۱۴۔ ایضاً، ص: ۱۱۰

References in Roman Script:

1. Mustansar Hussain Tarar, Pyar Ka Pehla Punjab, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2017, p. 88.
2. Mustansar Hussain Tarar, Pyar Ka Pehla Punjab, p. 88.
3. Ibid., p. 102.
4. Ibid., p. 132.
5. Ibid., p. 172.
6. Ibid., p. 252.
7. Mustansar Hussain Tarar, Lahore Deewangi, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2021, p. 172.
8. Mustansar Hussain Tarar, Lahore Deewangi, p. 182.
9. Mustansar Hussain Tarar, Pyar Ka Pehla Punjab, p. 314.
10. Ali Ahmad Fatmi, Faiz: Ek Naya Mutala‘ah, Naugawan, Aligarh: Educational Book House, 2012, p. 29.
11. Aamir Sohail, Syed Majeed Amjad: Bayaz-e-Arzoo Ba-Kaf, Multan: Shan Books, 1995, p. 67.
12. Mustansar Hussain Tarar, Lahore Deewangi, p. 43.
13. Mustansar Hussain Tarar, Lahore Awargi, p. 29.
14. Ibid., p. 110.